ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

چیئر مین، شعبہ اقبالیات،

علا مہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر

استاد شعبہ اردو،

علا مہ اقبال اوپن یو نیورسٹی، اسلا م آباد

احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی مساعی کا توضیحی جائزہ

Dr. Sahid Iqbal Kamran

Chairman, Iqbaliyat Department,

Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Dr. Noureena Tehreen Babar

Associate Professor, Urdu Department,

Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Ahmad Nadeem Qasmi-Urdu Poetry progressive trebds-Qasmi's poetry's features.

Ahmad Nadeem Qasmi is one of the few urdu writters who is renown for his diversity. His poetry is the centre of his creative writting which touches the heart of others due to depth in meaning. His short stories are the reflection of everyday life and its bitterness. The article cover both aspects of his writtings.

برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل اور وسط کا زمانہ اردو زبان و ادب میں تغیر، توسیع اور ترقی کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ دور تھا جب جہانِ اردو پر انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا ہونے والی نسل حکمرانی کر رہی تھی لیکن یہی وہ دور تھا جب اردو زبان و ادب کے نئے تاجدار جنم لے رہے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کا تعلق اسی نسل کے ساتھ ہے۔ اردو ادبیات کے انہی تاجداروں نے بیسویں صدی میں اردو نظم و نثر کے مزاج، موضوعات اور رجحانات کا

تعین کیا۔اس دور میں شعروسخن اور صحافت وادارت اور ناول وافسانہ نگاری کے ذہین ترین نابغے اپنا مقام پیدا کر رہے تھے۔اسی ماحول میں احمد ندیم قاسمی نے اپنی شناخت مستحکم کی،اردو ادب میں اس قدر متنوع اور کثیر الجہات شخصیات کم ہی نظر آئیں گی جس قدر اپنی جملہ مساعی کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نظر آتے ہیں۔انھوں نے بیک وقت افسانہ نگاری، شاعری،صحافت اور ادارت کے میدانوں میں نام پیدا کیا۔

احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی مساعی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری احمد ندیم قاسمی کا ''دل'' ہے۔ افسانہ نگاری ان کی ''دانش'' کا اظہار اور اس عظیم اور منفرد تخلیق کار کے سماجی رویے اور زندگی کرنے کا ڈھنگ ان کی ''دنیا'' کا عنوان ہے۔احمد ندیم قاسمی کی شاعری،افسانہ نگاری اور زیست کا رنگ ڈھنگ ان کے عصر کی سچائیوں،تلخیوں اور جبر کے معیار ومقدار کا ادراک کیے بغیر سمجھی نہیں جاسکتیں۔

قیام پاکستان سے ذرا سا پہلے اور نوزائیدہ مملکت کی تعمیر وتشکیل کی ابتدائی دھائیوں میں سامنے آنے والی دانش مملکت اور معاشرے کے معروضی حالات و واقعات کا آئینہ خیال کی جاسکتی ہے۔ برصغیر میں ایک نئی ترتیب اور نادر ترکیب سے ایک قوم اور ایک ملک کے وجود میں آنے اور اس ترتیب اور ترکیب میں دیگر کے علاوہ اردو زبان کے ایک نمایاں عامل کے طور پر شامل ہونے نے اظہار وابلاغ اور دانش وبینش کی معنویت کو دوچند کر دیا۔1938ء میں اقبال کی وفات کے کچھ ماہ بعد ان کا آخری مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' (فارسی+اردو) شائع ہوا۔گویا ایک عہد تمام ہوا۔اقبال نے اردو دنیا میں فکر وعمل اور اسلوب و بیان کے اتنے چراغ روشن کر دیے کہ ان کی روشنی میں کوئی کیا اضافہ کرتا،لیکن وہ جو دستور ہے،اسی روشنی نے معنی ومفہوم کی نئی اور تازہ دنیائیں آباد کیں۔معاش ومعاشرت سے لے کر سیاست وریاست اور مذہب سب نے نئے ملک اور تازہ معاشرے کے احوال پر اثر ڈالا۔انہی احوال نے شعروسخن کی تعمیر وتاثیر میں حصہ لیتے ہوئے روح عصر کی نمائندگی کی طرف چند قدم بڑھائے اور یہی احوال احمد ندیم قاسمی کا ذہنی پس منظر خیال کیے جا سکتے ہیں۔

> احمد ندیم قاسمی کے اظہار میں افسانہ نگاری کی نسبت سے شاعری کا حصہ کچھ کم ہے۔دھڑکنیں سے ارض وسما اور اسی میں بعد از وفات مرتب ہونے والے انوار جمال کو بھی شامل کر لیں تو یہ کل 12 مجموعے شاعری کے بنتے ہیں۔(۱) دوسری طرف افسانہ نگاری کے مجموعے ''چوپال'' سے لے کر ''کوہ پیما'' اور بعد از وفات شائع ہونے والے مجموعے ''پت جھڑ'' کو شامل کر کے کل 18 مجموعے بنتے ہیں۔(۲) احمد ندیم قاسمی نے اپنی پہچان کا آغاز ایک افسانہ نگار کے طور پر ''چوپال'' (1939ء) سے کیا لیکن وہ جو خود احمد ندیم قاسمی بھی کہتے ہیں کہ:
>
> ''شاعری فنون لطیفہ کی ملکہ ہے،افسانہ نگاری اس کے بعد آتی ہے۔''(۳)

تو شاعر ہونے کے احساس اور ایک شاعر کے طور پر اپنے ابلاغ پر احمد ندیم قاسمی کو ہمیشہ ناز رہا۔وہ سوچتے دماغ سے تھے تو محسوس دل کے ساتھ کرتے تھے۔''دل'' سے ان کا رشتہ بڑا گہرا اور پُر تاثیر تھا۔وہ جانتے تھے کہ شعر کا اختصار اپنے اندر کس قدر وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔نثر،تفصیل،ترتیب اور تجزیے کا تقاضا کرتی ہے۔عمومی طور پر مشرق کا مزاج نثر کا نہیں،شعر کا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی کی بطور دانشور بڑی اور نمایاں خوبی یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے نثر کی

تفصیل پسندی اور معروضیت کے ساتھ ساتھ شعر کی ایمائیت اور اختصار دونوں کو ترسیل معنی کا عنوان بنایا۔ اپنی شاعری سے وہ پیار کرتے تھے۔ شاعری ان کے لیے دل کی دنیا تھی۔ اس کی اپنی ایک فضا تھی۔

اس فضا کو قائم کرنے کے لیے احمد ندیم قاسمی ارتقائی مراحل سے گزرے، اپنے شاعرانہ ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''شروع شروع میں مجھے غزلیہ اور نشاطیہ رنگ سے شغف رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ..... بالکل متوازی دو اور لہریں بھی اسی رفتار سے رواں دواں رہیں، سماجی حالات سے بے زار ہو کر میں نے کئی تلخ نظمیں بھی کہی اور پکا مسلمان ہونے کی حیثیت میں مذہبی اور حکیمانہ رنگ میں بھی شاعری کی۔ غزلیہ اور نشاطیہ آہستہ آہستہ صحت مند غنائی رنگ میں بدلتا رہا۔ سماجی مسائل کے بیان میں تلخی کم ہونے لگی کیوں کہ صرف تلخی تو انا ادب پیدا نہیں کر سکتی۔'' (۴)

اس غیر محسوس ارتقائی عمل نے بطور شاعر احمد ندیم قاسمی کے مطمح نظر کو بے حد کشادہ کر دیا۔ ان کا خیال رہا کہ ''میری شاعری کا پینوراما میرے زعم میں غیر محدود اور آفاق در آفاق ہے۔'' (۵)

احمد ندیم قاسمی قطعات سے آغاز کرتے ہیں۔ آغاز شباب کا رومانی تحیّر اور فطرت و حسن کی طرف توجہ نمایاں نظر آتی ہے:

تیرے ہاتھوں کی حنا،
تیرے لبوں کی سُرخی
تیرے عارض کے چمن،
تیرے تبسم کے کنول
یوں مرے ذہن کو انوار
سے بھر دیتے ہیں
جیسے سورج کی جھلک
سے چمک اٹھے بادل
برس کے چھٹ گئے بادل
، ہوائیں گاتی ہیں
گرجتے نالوں میں
چرواہیاں نہاتی ہیں
وہ نیلی، دھوئی ہوئی
گھاٹیوں سے دو کونجیں
کسی کو دُکھ بھری آواز
میں بلاتی ہیں

پھیکی پھیکی چاندنی ہو، ہلکا
ہلکا ابر ہو
ایک گھاٹی میں ہوں بل
کھاتے ہوئے جھرنے
رواں
چار سُو پھولوں کی خوشبو
سے غنودہ ہو فضا
اور اِکتارے پہ لہراتی
ہوں تیری اُنگلیاں

احمد ندیم قاسمی نے قطعات نویسی سے آگے بڑھ کر نظم اور غزل کو اظہار ذات کا وسیلہ بنایا۔ نظم ان کے ترقی پسند اضطراب کی کفالت کر سکتی تھی لیکن ندیم کے دل کی دنیا میں جھانکنے کا دروازہ ان کی غزل ہے۔

جب ترا حکم ملا
،ترک محبت کر
دی
دل مگر اس پہ
وہ دھڑکا کہ
قیامت کر دی

کیا ترا جسم
ترے حسن کی
حدت میں جلا
راکھ کس نے
تری سونے کی
سی رنگت کر
دی

اور

تیرا پیمان وفا
راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا
کہ جب

چاہوں گا، مر
جاؤں گا

اب تو خورشید
کو ڈوبے
ہوئے
صدیاں
گزریں

اب اسے
ڈھونڈنے
میں تا بہ سحر
جاؤں گا

اور

میں تجھ کو پا کے
بھی کس شخص
کی تلاش میں
ہوں

میرے خیال
میں کوئی ترے
سوا ہی نہ ہو

وہ بات کر جسے
پھیلا کے میں
غزل کہہ لوں

سناؤں شعر جو
میں نے ابھی
لکھا ہی نہ ہو

اور

دیکھا جو غور
سے تو مجسم تجھی
میں تھا

وہ حسن جو
خیال سے بھی
ماورا ملا

دن بھر جلائیں
میں نے
امیدوں کی
مشعلیں

جب رات
آئی گھر کا
دیا تک بجھا ملا

ماضی سے مجھ
کو یوں تو
عقیدت رہی
مگر

اس راستے
میں جو بھی نگر
تھا، لٹا ملا

دشت فراق
میں وہ
بصیرت ملی،
ندیم

جو مجھ سے
چھن گیا تھا،
وہی جا بجا ملا

چند غزلوں کے یہ منتخب اشعار احمد ندیم قاسمی کے دل کی دنیا کی نمایندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند مسلک کے معتدل شاعر تھے، ان کا آبائی میلان مذہب کی طرف تھا۔ پیشہ آباء تبلیغ و ترویج دین سے منسلک رہا۔ نام بھی احمد شاہ ان کے سید ہونے کا اشارہ دیتا تھا حالانکہ انھوں نے بہ اصرار وضاحت بھی کر رکھی ہے کہ وہ سادات میں سے نہیں بلکہ خانوادہ اعوان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے آباء کا کام چونکہ وہی تھا جو معروف طور پر برصغیر میں سادات کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا یہ ابہام کسی نہ کسی صورت باقی رہا۔ اگرچہ اس کی کوئی اہمیت کسی بھی طرح سے نہیں ہے۔ قاسمی خود لکھتے ہیں کہ:

> ''میرا خاندان علاقہ سون سیکسر کے معزز ترین گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ احترام دنیوی دولت سے زیادہ مذہبی بزرگی کا منت کش ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے اسلاف عرب مجاہدوں کے ہمراہ ایران آئے اور تبریز کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا، وہاں سے بیشتر قسمت

آزماؤں کی طرح ہندوستان پہنچے اور ملتان میں قیام اختیار کیا، جب
بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو ملتان کے چند بزرگوں کو سون سیکسر
کے صنم پرستوں کو تدریس توحید کے لیے منتخب کیا۔ ان حضرات میں
میرے بزرگ بھی شامل تھے۔''(۶)

توصنم پرستوں کو تدریس توحید دینے کا یہی ذہنی اور آبائی پس منظر ہے جس نے احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند شاعری کو چیزے دیگر بنا دیا۔ دوسری بات جو ذہن میں رہنی چاہیے وہ اس دور کا سیاسی وسماجی ماحول اور اس کے اثرات تھے۔ ملکی سیاست کا شور اپنے آہنگ کے اعتبار سے بلند ترین سطح پر تھا۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے تو یہ دور تحریک خلافت کے عروج اور انجام کا زمانہ تھا۔ حسن اتفاق ہی کہیے کہ احمد ندیم قاسمی نے نوعمری یا تازہ ترین نوجوانی میں اپنی شاعری کا آغاز تحریک خلافت کے جری راہنما مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھ کر کیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی رحلت جو کہ بعد میں تحریک خلافت کی وفات بھی ثابت ہوئی، نوعمر احمد شاہ کو اس طور متاثر اور جذباتی طور پر اس قدر بے چین کرتی ہے کہ وہ ایک غمگین نظم لکھ کر اپنا دکھ اور اپنی ذہنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔ اس تحریک خلافت نے برصغیر کے مسلمانوں کو ترکی اور اس کے احوال کے ساتھ محبت، مروت، اخوت اور چاہت کے رشتے میں منسلک کر دیا اور وقت نے ثابت کیا کہ یہ انسلاک لازوال ہے۔ برصغیر کے نوجوان مسلمانوں کا آزاد ترکی کی طرف پرامید نظروں سے دیکھنا، بعد میں ان کے شعور کا حصہ بن گیا۔ تحریک خلافت اور اس کے متعلقات کا اظہار احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بھی نظر آتا رہا۔ پروفیسر فتح محمد تحریک خلافت کی ہنگامہ خیزیوں کو احمد ندیم قاسمی کے لڑکپن کی ناقابل فراموش یادوں کا بیش قیمت سرمایہ قرار دیتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ:

''ہر چند تحریک خلافت ندیم کے شعور مند ہونے سے پہلے ہی سیاسی ناکامی سے دوچار ہو کر تنظیمی اعتبار سے منتشر ہو چکی تھی مگر آزادی و مساوات اور بغاوت و انقلاب کے ساز پر چھیڑے گئے نغمات اور حریت کی لے پر گائے جانے والے عوامی گیت برصغیر کے گوشے گوشے میں زبان زد عام تھے۔ سامراج دشمنی اور انقلاب دوستی کے ترانے ندیم کے شخصی مزاج اور فنی مسلک ہر دو کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعد کو یہی ذہنی اور نفسیاتی پس منظر بنا احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند شاعری اور افسانہ نگاری کا۔''(۷) اس دور میں اردو میں ترقی پسند دانشوروں کی ایک کہکشاں آباد نظر آتی ہے، لیکن احمد ندیم قاسمی اس ہجوم میں اپنی ایک الگ شناخت کو قائم رکھتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی پر خلوص ترقی پسند تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں:

''اس وقت ترقی پسند شاعری کے دو رنگ رائج تھے اور شاید ہمیشہ
رائج رہے ایک تو فیض صاحب کا رومانی، کیفیت سے بھرپور،
شائستہ، تھوڑی میں محزونیت لیے ہوئے، استعارہ و تشبیہ اور اپنے
نئے الفاظ و تراکیب سے جگمگاتا ہوا اسلوب، اور دوسرا سردار جعفری کا
بلند آہنگ، خطیبانہ، براہ راست گفتگو کا انداز ..... قاسمی صاحب کا
اسلوبِ شعر ان دونوں سے مختلف تھا اور اسے مقبول ہونے میں دیر

لگی۔''(۸)

عمومی طور پر ہر لکھنے والا، زندگی اور اس احوال میں بہتری چاہتے والا، اپنے ماحول اور معاشرے کے بارے میں سوچنے والا ترقی پسند ہی ہوتا ہے۔ اس کی ترقی پسندی کسی مخصوص سیاسی مسلک اور نظریے کے تابع ہونے کی بجائے، زندگی میں مثبت توسیع اور ترقی کے ساتھ مشروط ہونی چاہیے۔ ذرا سوچیے کہ وہ لکھنے والے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن نہیں تھے، وہ ترقی پسند نہیں تھے؟ ہاں اگر وہ حیات پرور ادب تخلیق کر رہے تھے تو وہ ترقی پسند تھے۔ اس تناظر میں احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسندی اپنے انداز و آہنگ اور ترکیب و ترتیب کے اعتبار سے منفرد تھی۔ یہ تاثر کہ:

''ترقی پسندی کے شوق میں ندیم نے تہذیبی روایات کو خیر باد نہیں کہا اور اپنی ثقافتی قدروں سے رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ اشتراکیت کے کندھے سے کندھا ملانے کے باوجود دوسرا کندھا دین و مذہب سے ملائے رکھا اور یہی ندیم کا امتیاز ہے۔''(۹) اپنی کچھ معنویت تو رکھتا ہی ہے لیکن امر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تخلیق کار کے طور پر ندیم نے جمود کے خلاف بغاوت، تقلید سے بے زاری اور منجمد فکری رویوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی شخصیت کے توازن کو برقرار رکھا۔ وہ شاعر تھے، صحافی اور مدیر تھے، کمال کے افسانہ نگار تھے۔ ان کے لیے ابلاغ اور ترسیل معانی کے لیے کئی میدان سجے ہوئے تھے اور کچھ یہی زمانہ فیض احمد فیض کی شاعری اور مقبولیت کا بھی ہے، فیض کا بڑا میدان شاعری رہا اور اس میدان میں ان کا حریف ہونے کے دعویدار آتے جاتے رہے کیونکہ بہر حال فیصلہ ہمیشہ وقت کرتا ہے۔ ایک ہی عہد کے دو ناموراور معاصر شعرا کا تقابل کبھی بھی معروضی نتائج سامنے نہیں لاتا۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں شاید یہ احساس زیر سطح موجود رہا کہ وہ اپنے کسی معاصر سے بڑے نہیں تو برابر کے شاعر ضرور شمار کیے جانے چاہیں۔ اب اگر فیض کی مثال لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پچاس، ساٹھ اور ستر کی دھائیوں میں ''سرخوں'' اور ''پسندوں''(۱۰) کے محاربے نے ان کے مخالفین کو ایک اچھا نشانہ فراہم کر رکھا تھا۔ فیض کی مخالفت کے عمل نے ان کی محبوبیت میں مسلسل اضافہ ہی کیا۔ کچھ ان کی اپنی دھیمی اور شاعرانہ شخصیت اور زیادہ ان کے شعر کی تاثیر اور خلوص اور سچائی کہ ان کی مقبولیت اور محبوبیت بڑھتی ہی گئی، ایک وقت آیا جب فیض پر طعن کرنے والے بھی اپنے سابقہ رویے سے تائب ہو کر ان کی توصیف کرنے لگے۔ ایسی شدت کی مزاحمت اور مخالفت احمد ندیم قاسمی کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کے شعر کو سراہا گیا، مقبولیت بھی ملی لیکن اسے ان کے واحد ہنر کے طور پر شناخت کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہایت ہنر مند اور پر تاثیر افسانہ نگار تھے۔

وہ ترقی پسند رہتے ہوئے خود کو حیات کی مادی تعبیر اور الحاد سے گریزاں پاتے تھے۔ اس دور کے بیشتر ترقی پسند ملحد خیال کیے جاتے رہے، اگرچہ یہ امر واقعہ نہ ہوا، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ ایک تو اشتراکی فکر و خیال کے ایک وصف کے طور پر اور کچھ زیادہ اس عہد کے الزام تراش ''پسندوں'' کے طعن کے طور پر ہر اشتراکی کو خدا کا باغی اور منکر قرار دیا جاتا رہا۔ ''پسندے'' جانتے تھے کہ معاشرے اور نظامِ سیاست و ریاست کے باغی کو گناہ گار قرار دینا مشکل امر ہے، تو معاشرتی عتاب کا نشانہ بنانے کے لیے کسی کو کافر قرار دینا اور کفر بھی وہ جو منکر خدا ہو، ملحد ہو زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے حالانکہ احمد ندیم قاسمی کی طرح دیگر ترقی پسند دانشور الحاد سے کوسوں دور تھے۔ سرخوں اور پسندوں کی اس جنگ نے انقلابی شاعری اور مزاحمتی ادب تک کو خدا اور مذہب سے بغاوت کی شاعری اور ادب بنا کر رکھ دیا۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بطور ترقی پسند ادیب احمد ندیم قاسمی کا ذہن اس معاملے میں ہمیشہ کسی الجھن سے آزاد رہا۔ وہ خلوص نیت سے سمجھتے تھے۔ انقلابی شاعری

کی اصل دشمنی انسان دشمن اور سماج دشمن طرزِ فکر و عمل کے ساتھ ہے نہ کہ ان دیکھے خدا کے ساتھ۔ قاسمی ایسے بزعم خود انقلابی شاعروں سے بھی بے زار تھے جو سماج اور سیاست کے اصل مجرموں کو نظر انداز کر کے خدا کے ساتھ چھیڑ کو اپنا ہنر اور اپنا فخر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی خلوص نیت سے سمجھتے تھے، چاہے آپ ان سے اختلاف بھی کریں کہ ترقی پسند طرز فکر و عمل کا بدیہی مطلب مذہب اور اس مذہب کے تصور خدا سے مکمل لاتعلقی اور بے زاری نہیں ہے۔ دراصل فرد اور معاشرے کے دشمنوں یا مجرموں کے خلاف آواز اس معاشرے میں مروج و مقبول مذہب اور تصور خدا کو نشانہ بنائے بغیر بھی اٹھائی جا سکتی ہے اور ہر زیرک ترقی پسند اس امر سے آگاہ تھا۔ اگرچہ فرد اور معاشرے کو غلام بنانے کے لیے مذہب اور اس مذہب کے تصور خدا کو بے دریغ استعمال کیا گیا اور انسان کی ہمہ جہت تذلیل بھی ہوئی لیکن پھر بھی احمد ندیم قاسمی خیال کرتے تھے کہ ہمارے معاشرے میں ترقی پسند فکر و عمل کا اصل محاربہ مذہب اور خدا کے ساتھ نہیں استحصال کرنے والے مجرموں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ وہ پاکستان کے دیہی اور حقیقی معاشرے کی رگ رگ سے واقف و آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ پاکستان میں بھی بعض عناصر بڑی شد و مد کے ساتھ نظریہ پاکستان کے نام پر اپنے تفوق اور اختیار کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے دوران انہی عناصر کی مجرمانہ سیاست سے ذاتی طور پر آگاہ تھے۔ احمد ندیم قاسمی بتاتے ہیں کہ:

> ''میں تحریک پاکستان میں ذاتی طور پر ایک ادنی کارکن کی حیثیت سے شامل تھا۔ اس لیے مجھے علم ہے کہ جن عناصر نے اس زمانے میں اس تحریک کی نہ صرف کوئی حمایت نہ کی بل کہ بس چلنے پر مخالفت تک کر ڈالی۔ وہ نظریہ پاکستان کے سب سے بلند آہنگ حمایتی ہیں۔''(۱۱)

ایسے ہی عناصر ''پسندے'' کہلاتے تھے احمد ندیم قاسمی اس دور کے بعض انقلابی شعرا کی بے معنی مذہب بے زاری کے خلاف بلند آہنگ احتجاج بھی کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ:

> ''انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انھیں خدا سے کیوں بَیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو یہ ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے۔ مذہب اگر خود فکری کے نشو و نما میں کسی نوع کی مزاحمت کر سکتا تو مذہب مذہب نہ رہتا، فاشسٹی احکام کا پلندا بن کر رہ جاتا۔ مذہب ہمیں بد اخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا اور اگر خود فکری و خود شناسی ہر نوع کی آزاد خیالی پر مبنی ہے تو پھر الحاد بھی خود فکری کا کوئی قابل فخر نتیجہ نہیں۔ مادہ کی قوت مسلم! لیکن مادہ کی تکوین و تعمیر کے پس پردہ

جو غیر محسوس حسن کارفرما ہے، اس سے ایک سچا شاعر منکر نہیں ہوسکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالم گیر حسن کا احساس ہے۔'' (۱۲)

احمد ندیم قاسمی کے اس طرز احساس نے انھیں ترقی پسند دنیا میں انفرادیت بخشی اور یہ ہمیشہ پرشور ترقی پسند شعرا و ادباء سے ایک محترم فاصلے پر نظر آئے۔ احمد ندیم قاسمی کی اسی انفرادیت کا بلیغ ترین تجزیہ ڈاکٹر انوار احمد کا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''.....ندیم کی ترقی پسندی علمی یا نظریاتی نہیں، بلکہ مشاہدے اور تجربے کی دین ہے۔'' (۱۳)

ترقی پسند شعر کے اسلوب و آہنگ کا بھی فرق احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا اساسی وصف بھی ہے۔ وہ ترقی پسند رہتے ہوئے زمانے کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ اور ہم مزاج ہونے کا ہنر جانتے تھے۔ غیر شعوری طور پر سہی لیکن طبقاتی فرق و بُعد کے احساس نے ان کی ترقی پسندی کو دیگر ترقی پسندوں سے ایک خاص فاصلے پر ہی رکھا۔ بات بالکل چھوٹی سی ہے کہ وہ مے نوشی سے گریزاں تھے، بلکہ متنفر کہیے اور ابتداء میں محکمہ آب کاری کی ملازمت بھی، بے حد ضرورت کے باوجود صرف اسی لیے چھوڑ دی تھی کہ وہاں شراب کے اڈوں اور بھنگ و افیون کے ٹھیکوں کا معائنہ کرنا پڑتا تھا۔ یہاں اسی ملازمت میں اپنے فرائض منصبی اور ان سے اپنی بے زاری کا ذکر کرتے ہوئے قاسمی اپنے بڑے بھائی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ: ''.....اسلام جن نشوں سے ہمیں منع کرتا ہے، انھیں کے ٹھیکوں کی نگرانی میرے ذمے ہے۔'' (۱۴) شراب مذہبی طور پر حرام تھی۔ اس احساس نے بعد میں دو کام کیے ایک تو یہ احساسِ زہد زیر سطح توانا رہا اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے مے نوش معاصرین سے ایک فاصلے پر ہی رہے کہ دراصل کہیں کہیں وہ ان کو خطا کار خیال کرتے تھے۔ سہ ماہی معاصر میں شایع ہونے والے اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''فیض احمد فیض'' کے آغاز میں احمد ندیم قاسمی اپنے معروف اور نامور معاصر فیض احمد فیض کے ساتھ اپنے ربط و تعلق اور رشتے کی نوعیت اور پیچیدگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''.....ہم ایک ہی ادبی تحریک سے متعلق تھے اور صحافت کے ایک ہی ادارے میں برسوں ایک ساتھ کام کیا، مگر میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ میں فیض صاحب سے ذرا فاصلے پر ہوں یا فیض صاحب مجھ سے ذرا فاصلے پر ہیں۔'' (۱۵)

اور قاسمی صاحب کے تجزیے کے مطابق اس فاصلہ کی دو وجوہ تھیں اول طبقاتی تفاوت اور دوم پینے پلانے کی محفلوں میں عدم شرکت۔ سامراج دشمنی اور انسان دوستی احمد ندیم قاسمی کی دانش کے دو بڑے محور ہیں۔ ان کی دانش کی گہرائی کو پانے کے لیے ان کا فیض سے موازنہ بالکل بھی ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ فیض کے فکر و عمل اور زیرکی کی سطحیں دیگر ہیں۔ احمد ندیم

قاسمی نے معاملات حیات وکائنات میں فرد کی مرکزیت پر اصرار کرتے ہوئے اپنی انسان دوستی کا رفیع الشان محل تعمیر کیا ہے۔ اشتراکی نظم سیاست وریاست میں فرد کے مقابل ریاست کو مرکزیت حاصل ہے۔ احمد ندیم قاسمی ترقی پسند منصف تھے۔ اشتراکیت کے لیے ان کے دل میں بہ مقابلہ سرمایہ دارانہ/ جاگیردرانہ نظم معاشرت سیاست کے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ لیکن اپنے ذاتی اور سماجی تجربات ومشاہدات نے انھیں جس نروان سے روشناس کرایا وہ ہر شے کے مقابل انسان کو عظیم وجلیل قرار دیتا ہے۔ کارزار حیات میں انسان کی مرکزیت کو خلوص نیت کے ساتھ سمجھتے ہوئے وہ انسان کو جملہ فنون کا بنیادی موضوع قرار دیتے ہیں:

> ''.....میں انسان اور اس کی تازگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں۔ اگر انسان موجود ہے اور اس کرّے پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے۔ انسان اور خدا، ذات اور کائنات، حقیقت اور مابعد الطبیعات کے رشتوں اور مسلوں پر بھی انسان اور زندگی کی ہی موجودگی میں غور ہوسکتا ہے۔ سو میری نظر میں انسان اہم ہے اور فن اسی صورت میں اہم ہے جب وہ انسان کو حسن اور توازن حاصل کرنے میں مدد دے۔ وہ انسان کو منفی انداز میں اداس نہ کرے۔ وہ زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بنائے اور اس میں وہ رنگ وآہنگ پیدا کرے جنھیں فنون لطیفہ کی بنیادیں قرار دیا جاتا ہے۔'' (۱۶)

انسان سے محبت، کائنات میں اس کی مرکزیت اور اہمیت مستقل طور پر ان کی نظم ونثر کا محور نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات احمد ندیم قاسمی کے عبد اور معبود کے مابین حد فاصل قائم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن جہانِ دانش میں احمد ندیم قاسمی کا یہی تفوق ان کو ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔

> احمد ندیم قاسمی کے لیے شاعری اور افسانہ نگاری ابلاغ اور ترسیل معنی کا ایک وسیلہ رہے۔ انھوں نے شاعر اور افسانہ نگار کو کبھی باہم متصادم نہ ہونے دیا۔ خود ان کے نزدیک ''میری شاعری کو افسانہ نگاری اور افسانہ نگاری کو شاعری نے نکھارا ہے۔'' (۱۷)

لیکن معلوم طور پر ان کی فنی عظمت اور دانش وبصیرت کا بڑا میدان ان کی افسانہ نگاری ہے۔ پاکستان کا معاشرہ اساسی طور پر دیہی معاشرہ ہے، شہری معاشرے بھی اپنے طرز فکر وخیال کے حوالے سے دیہی ذہنیت اور ذہانت سے جڑے ہوئے ہیں۔ خود احمد ندیم قاسمی کا تعلق دیہی معاشرت سے تھا لیکن یہی کافی نہیں، ان کی زندگی کا بڑا حصہ بڑے شہروں میں بھی گزرا، اصل نکتہ ان کی وہ توجہ اور دلچسپی ہے جو انھیں پاکستان کے حقیقی معاشرتی خدوخال سے رہی۔ دیہی زندگی اور اس کے احوال ومسائل بنیادی طور پر بے ریا زندگی کے تصنع سے پاک احوال ومسائل ہیں۔ وہاں کی محبت شدید، وہاں کی نفرت عمیق، وہاں کی دوستی انمول وہاں کی دشمنی تند وتیز، پاکستانی معاشرے کے اصل کرب اور دکھ کو جس طور پر احمد ندیم قاسمی نے سمجھا، اس کی دیگر مثال نہیں ملتی۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں سلطانی، ملائی اور پیری نیز انھی سے متصل جاگیرداری اور نوسربازی کے خلاف شدید مزاحمت نظر آتی ہے۔ وہ اردو کے نامور افسانہ نگار پریم چند سے متاثر ہونے کا تاثر بھی دیتے ہیں، دونوں کی توجہ کا میدان دیہی زندگی اور اسی کی وساطت سے حیات انسانی کی اسرار ورموز کی نقاب کشائی تھی، لیکن احمد ندیم قاسمی کے کمال

فن نے دیہی زندگی کی سادگی، معصومیت، دکھ، محرومیوں اور ان سب کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دبی دبی سی خواہش کو ایک بڑا رومان بنا کر رکھ دیا۔ وہ اس رومان کے ساتھ اپنی تخلیقی زندگی بسر کرتے ہیں۔

حواشی

۱۔ دھڑکین 1941ء (قطعات)، رم جھم 1944ء (قطعات، رباعیات)، جلال و جمال 1946ء، شعلہ گل 1953ء، دشت وفا 1963ء، محیط 1976ء، دوام 1979ء، لوحِ خاک 1988ء، جمال (نعتیہ مجموعہ) 1992ء، بسیط 1995ء، ارض وسما 2006ء، انوار جمال (حمد، دعا، نعت، سلام) 2007ء۔

۲۔ چوپال 1939ء، بگولے 1941ء، طلوع وغروب 1942ء، گرداب 1943ء، سیلاب 1944ء، سیلاب و گرداب (انتخاب) 1961ء، آنچل 1945ء، آبلے 1946ء، آس پاس 1948ء، در و دیوار 1949ء، سناٹا 1952ء، بازار حیات 1955ء، برگ حنا 1959ء، گھر سے گھر تک 1963ء، کپاس کا پھول 1973ء، نیلا پتھر 1980ء، کوہ پیما 1995ء، پت جھڑ 2007ء۔

۳۔ سہ ماہی صحیفہ، احمد ندیم قاسمی نمبر (لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت اول، 2011ء) ص: 461

۴۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ جلال و جمال کا دیباچہ مشمولہ سہ ماہی جملہ صحیفہ، احمد ندیم قاسمی نمبر (لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت اول، مئی 2011ء) ص 421

۵۔ احمد ندیم قاسمی کا آخری انٹرویو، مشمولہ سہ ماہی صحیفہ، ص 461

۶۔ جلال و جمال کا دیباچہ، مشمولہ سہ ماہی صحیفہ، احمد ندیم قاسمی نمبر (لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت اول، 2011ء) ص: 412-413

۷۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنی تالیف ''احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار'' میں اس دور کے برصغیر میں مقبول ایک ٹپا (لوک گیت) نقل کیا ہے:

انور موڑ مہاروے
سانوں تیریاں لوڑاں
تیرے ہندیاں یارا وے
سانوں لٹ لیا چوراں

یعنی ترک مجاہد غازی انور پاشا کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ: اے انور اپنے گھوڑے کی مہار ہماری طرف موڑ لو، ہمیں تمہاری شدید ضرورت ہے اے ہمارے دوست (دیکھ) تمہارے ہوتے ہوئے ہمیں چوروں (انگریزوں) نے لوٹ لیا ہے۔

ملک، فتح محمد، احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، بار اول، 1991ء) ص 46

۸۔ مضمون قاسمی صاحب، شمس الرحمٰن فاروقی، مشمولہ سہ ماہی صحیفہ، ص: 155 - 156

۹۔ سرخے بہ معنی کیمونسٹ، ترقی پسند اور پسندے بہ معنی اسلام پسند۔ اس دور میں حکومتوں کی سرپرستی اور ایما پر ''پسندوں'' نے زندگی کے ہر شعبے سے ''سرخوں'' کا قلع قمع کرنے کے لیے ہر ناجائز حربے کو روا رکھا۔

۱۰۔ خطبہ ادیب اور مملکت، احمد ندیم قاسمی مشمولہ سہ ماہی مجلّہ صحیفہ، احمد ندیم قاسمی نمبر، ص 404

۱۱۔ جلال و جمال کا دیباچہ، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ صحیفہ، ص 427

۱۲۔ مضمون احمد ندیم قاسمی کی غزل، خاور اعجاز، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، خصوصی شمارہ، احمد ندیم قاسمی نمبر، شمارہ نمبر 108، جنوری تا جون 2016ء (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان) ص 297

۱۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، نقش ثانی، 2010ء) ص 311

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی کی نثر نگاری، سبینہ اویس، ڈاکٹر، ص 29

۱۵۔ سہ ماہی معاصر، جلد نمبر I، شمارہ I، لاہور: ادارہ معاصر، جنوری تا مارچ 2001ء، ص: 19

۱۶۔ میرا نظریہ فن، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ماہِ نو، احمد ندیم قاسمی نمبر، جلد 69، شمارہ 2، 2016، وزارت اطلاعات و نشریات و قومی ورثہ، اسلام آباد، ص 308

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی کی نثر نگاری، سبینہ اویس، ڈاکٹر (اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع اول، گست 2015ء) ص 60